۱۸۵۷ء میں علامہ نے یوسف علی خاں کو جو اس وقت رام پور میں مسند نشین ہوگئے تھے شعر گوئی میں غالب سے تلمذ اور انہیں اپنا مشیر سخن بنا لینے کا مشورہ دیا جس کے نتیجے میں غالب والیٔ رام پور کے مشیر سخن بن گئے۔ اور آخر عمر تک یہ تعلق رہا۔ اور اس کے صلے میں ان کو تا زندگی ماہانہ نذرانہ پیش کیا جاتا رہا بلکہ غالب کے بعد ان کی اہلیہ کی خدمت کی گئی۔

مرزا غالب کو بھی علامہ سے شیفتگی تھی۔ ان کے فضل و کمال اور سخن شناسی پر اعتماد تھا، جس کا اظہار ہر موقع پر اُن کی تحریروں سے ہوتا رہا۔ ۱۸۲۷ء میں وہ سفر کلکتہ پر روانہ ہونے سے پہلے فیروز پور جھرکہ گئے تھے اور جاتے وقت علامہ سے نہیں مل سکے تھے، اس کا اظہار ایک خط میں کیا ہے جو صنعت تعطیل میں ہے (گل رعنا) پھر جب کلکتے پہنچے اور اپنے مقدّمے کے سلسلے میں وہاں رہنا پڑا تو جن احباب کی یاد سے مضطرب رہے اس کا اظہار ایک مثنوی (چراغ دیر) میں کیا ہے۔

زارباب وطن جویم سخن را   کہ رنگ و رونق اندازاین نہ چمن را

چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم   ہم از حق فضل حق را باز خواہم

پھر جب علامہ نے کمپنی کی ملازمت ترک کر کے ریاست جھجر جانے کا عزم کیا تو غالب نے کلکتے کے ایک اخبار آئینہ سکندری کے نام اپنے ایک مراسلے میں اس ترکِ تعلق کے اسباب، اہلِ دہلی اور خصوصاً شاہ زادہ (بعد میں شاہ) ابوظفر سراج الدّین کے جذباتِ غم قلمبند کر کے اشاعت کے لیے روانہ کیے جس کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں، والیٔ رام پور کے قصیدۂ مدحیہ میں علامہ کا ذکرِ خیر یوں کرتے ہیں:

بتو قیع فضل حق آں علین معنی   کہ آباد برائے فراواں فرستم

سن ستاون کے معرکۂ جہاد کے بعد جب علامہ گرفتار کر لیے گئے اور ان پر مقدمہ چلا اور فیصلہ سنا دیا گیا تو غالب یوسف مرزا کے نام لکھتے ہیں:

"مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم حبس دوام بحال رہا۔ بلکہ تاکید کی گئی ہے کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا بیٹا ولایت

میں اپیل کیا جا ہتا ہے، کیا ہونا ہے؛ جو ہونا تھا وہ ہو چکا! انا للہ وانا الیہ راجعون،، (اردوئے معلیٰ)

اکتوبر ۱۸۶۱ء میں ان کے شاگرد میاں داد خاں سیاح کلکتے گئے تھے۔ اس وقت علامہ کا وصال ہو چکا تھا مگر غالب کو خبر نہیں ہوئی تھی اس لیے سیاح کو لکھتے ہیں :

" ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو، تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھے لکھو۔ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟ "

پھر جب غالب تک وصال کی خبر آخر پہنچ گئی تو لطیف احمد بلگرامی کے نام تڑپ کر لکھتے ہیں : " کیا لکھوں اور کیوں؟ ۔ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور، ہاتھ میں رعشہ طاری ہے، کان سماعت سے عاری ہے، مخزا ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے اور غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے ۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اگر جواں ہوتا تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا، اسی برس کا بوڑھا ہونے کو آیا دعائے مغفرت کا امید وار ہوں ۔" (جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں ۔ انکا احترام آپ پر فرض ہے ۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کیمطابق بیحرمتی سے محفوظ رکھیں ۔

رسولُ اللہ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں

مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر

(سترہویں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں)

(قسطِ اوّل: پیش لفظ)

از:- عبد القادر جیلانی ، ایم اے (اسلامیات)

تہذیبیں گروہِ انسانی کی شدید محنت اور جاں فشانی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ہر گروہ کو اپنی تہذیب سے فطری وابستگی ہوتی ہے۔ جب تک اس کی تہذیب اسے تسکین عطاء کرتی ہے وہ دیگر تہذیبوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب کوئی بیرونی تہذیب اس پر دباؤ ڈالنے لگتی ہے تو معاشرہ اس کی مدافعت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور مخالف تہذیب کو اپنی تہذیب پر اثر انداز ہونے نہیں دیتا۔ یہ مدافعت حربی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرتی ہے اور اگر حربی مدافعت کی قوت نہیں رہ جاتی تو غالب معاشرے کے خلاف سرد جنگ اختیار کی جاتی ہے۔ تاآنکہ دونوں میں سے ایک کو قطعی برتری حاصل نہ ہو جائے۔ بصورتِ دیگر کوئی نئی تہذیب وجود میں آتی ہے جس میں متحارب معاشرے ضم ہو جاتے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی تک بحرِ روم سے ملحق تمام علاقے رومن امپائر کے صوبے بن چکے تھے۔ اسلام سے قبل رومن امپائر کا کرۂ ارض پر کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ رومن امپائر کی پیش رو گریک ایمپائر تھی جسکے عظیم شہنشاہ سکندرِ اعظم کی قلمرو میں مصر سے پنجاب تک کا پورا علاقہ شریک تھا، رومن خود کو یونانیوں کا جانشین سمجھتے تھے اور اس اعتبار سے یونانی تہذیب کے وارث تھے۔ یہ مشترکہ معاشرہ ہلینک سوسائٹی کہلاتا تھا۔ اس معاشرے نے مصری، آشوری، کلدانی، یہودی، فنیقی اور مینوئی تہذیبوں کو شکست دے کر اپنی برتری قائم کرلی تھی۔ ان قدیم تہذیبوں کے ورثے اپنے معاشرے میں منتقل کرلئے تھے۔ ان کا علم دفن بامِ عروج پر تھا۔ ایک ہزار سال سے دنیا پر رومن برتری مسلمہ تھی۔ روم کا نام

عظمت اور سربلندی کی علامت بن گیا تھا - رومن خود کو دُنیا کا متمدّن آقا تصوّر کرتا تھا - جسے دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل تھا - باقی دُنیا صرف اس لئے تھی کہ رُوم کی خدمت گذاری کرے -

روم ثقافت میں یونان کا شاگرد تھا - یونانی فلسفہ اس کے لئے حجّت تام تھا - اس کی روشنی میں ہلینک معاشرہ یہ خامی محسوس کرتا تھا کہ اس کے مروّجہ مذہب افلاطون اور ارسطو کی فکر سے ہم آہنگ نہ تھے -

پال رومی شہری ہونے کے باعث اس ضرورت سے آگاہ تھا - حضرت عیسیٰؑ کے بعد اوّل تو خود اس نے عیسائیّت کی ترویج اس انداز سے کی کہ ہلینک معاشرے کے لئے قابلِ قبول ہو - پھر اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو رومن معاشرے نے اپنے سانچے میں ڈھال کر پوری کر دی - جب عیسائیّت نے رومن قالب اختیار کر لیا تو رومن شہنشاہ نے اپنے اقتدار کے بل پر رومن امپائر میں نافذ کر دیا - اس طرح یہ خامی بھی دور ہو گئی - اب رومن معاشرہ بخیالِ خویش عالمی اقتدار، عالمی فکر، عالمی سچائی، عالمی برتری کا حامل تھا - رفتہ رفتہ اقتدار، فکر اور برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا - صرف عالمی برتری کا حامل تھا - رفتہ رفتہ اقتدار، فکر اور برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا - صرف عالمی سچائی کا بھرم باقی رہ گیا - پھر یہی بھرم سب سے بڑی قدر بن گیا - باقی قدریں ثانوی ہو گئیں -

یہ تھا وہ پس منظر (باب اوّل) جس میں مغرب نے اسلام کو طلوع ہوتے دیکھا - ساتویں صدی عیسوی نصف اوّل میں عرب اسلام کا جھنڈا لے کر بیک وقت روم و ایران کی عظیم سلطنتوں سے نبرد آزما ہوئے - سلطنتِ ایران کا وجود تو پچیس سال کے اندر اندر ختم ہو گیا لیکن سلطنتِ روم اپنی بقا کے لئے مسلسل جنگ کرتی رہی - اس دور میں سلطنتِ روم دو حصّوں میں منقسم تھی - مشرقی سلطنتِ روم (بازنطین) اصل اقتدار اور طاقت کی حامل تھی اس وقت تک مغرب رومن امپائر کا جزو تھا - گو اس کی اپنی جداگانہ حیثیت نہ تھی - تاہم مغربی اور مشرقی عیسائیت میں میں رقابت پیدا ہو چکی تھی - اور عیسائیت کو رومن شہریت پر تفوّق میسّر آ چکا تھا -

جب تک عرب بازنطین سے نبرد آزما رہے۔ مغرب ایک تماشائی تھا۔ مشرقی سلطنت روم یا مشرقی عالم عیسائیت کی پسپائی ایک رقیب کی پسپائی تھی۔ بازنطین کی شکست گویا مشرقی کلیسا کی شکست تھی لیکن جب ان شکستوں کے مختلف النوع اثرات ظاہر ہونے لگے تو مغرب نے بھی اپنی حفاظت کی جدوجہد شروع کی۔ اس کا اوّلین ردِ عمل کمزور بازنطین سے خود کو آزاد کرانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بازنطین نے مغرب کی علیحدگی کو بادِل ناخواستہ برداشت کیا۔ اور اپنے زیرِ اقتدار رکھنے کے لئے طاقت کے استعمال سے گریز کیا۔

مغرب خود کو عظیم رومن امپائر کا وارث تصور کرتا تھا۔ عرب جیسی ناقابلِ اعتنا، قوم کے ہاتھوں رومن صوبوں کا نقصان تصور کر رہا تھا۔ انہیں پھر سے فتح کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ رومن نخوت کے لئے اقتدار اور برتری کا اس گمنام قوم کے ہاتھوں مجروح ہونا ناقابلِ برداشت تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں عرب نہ صرف اسپین فتح کر چکے تھے بلکہ سسلی سے اطالیہ پر حملے کر رہے تھے۔ نویں صدی میں دوبارہ رُوم کا محاصرہ کر چکے تھے۔ روم کو مغربی عالمِ عیسائیت میں حرمِ مقدس کا درجہ حاصل تھا۔ روم پر حملوں کو کلیسا کبھی نہ بھلا سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کی نصف سے مغربی سیاست کلیسا کے اقتدار میں آگئی۔ جس کے بعد کلیسا مغربی معاشرے پر مسلّط ہو گیا۔ اس نے کلیسائی قدروں کو معاشرتی قدریں بنا کر پورے معاشرے کو کلیسا کے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ کلیسا کے لئے سلطنتیں بننے لگیں اور کلیسا پہ سلطنتیں قربان کی جانے لگیں۔

کلیسا کا اقتدار مذہبی تھا۔ اس کا رقیب اگر ہو سکتا تھا تو صرف دوسرا مذہب، عرب سیلِ بے پناہ کی طرح عالمِ عیسائیت کو درہم برہم کر رہے تھے۔ ان کی توانائی کا راز محض مذہب تھا۔ کلیسا نے نہ صرف عرب بلکہ اسلام کو دشمن قرار دیا۔ اور اس کے خلاف مختلف محاذ کھولے۔ حربی مقاصد کے لئے اس نے جنگجو جرمن اقوام کو استعمال کیا۔ فکری محاذ خود سنبھالا۔

دشمن کے خلاف جنگی پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا۔ پروپیگنڈے کی قوت سے کلیسا پوری طرح واقف تھا۔ اسی پروپیگنڈے کے بل پر کلیسا اُستوار ہوا، پروپیگنڈے ہی

کے بل پر چوتھی صدی عیسوی میں رومن امپائر کو کرسچین امپائر بنایا تھا۔ اور اسی قوت سے کلیسا نے مغرب میں تمام رقیب مذاہب کا صفایا کیا۔ اسی قوت سے جرمنوں کو قابو میں کیا۔ کلیسا کے اختیار میں صرف یہی ایک ہتھیار تھا جس کی مدد سے وہ نہ صرف خود کو بلکہ مغربی معاشرے کو دشمن سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

مغرب پر اگر صرف سیاسی دباؤ ہوتا تو شاید کلیسا کا پروپیگنڈا اس قدر مقبول اور نتیجہ خیز نہ ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کا شدید دباؤ ہمہ جہتی تھا۔ سیاسی اعتبار سے سلطنت روم کا نصف رقبہ اور بحر روم کی اجارہ داری چھن چکی تھی۔ اس سے قبل رومی معاشرے نے کبھی اس قدر شدید نقصانات کسی کے ہاتھوں نہ اٹھائے تھے۔ ہزار سالہ بالادستی نے یہ عقیدہ راسخ کر دیا تھا کہ روم لافانی ابدی اور لازوال ہے۔ عیسائیت نے اس عقیدہ کو مذہبی رنگ عطا کیا کہ یہ شہر خدا کا شہر تھا۔ قیامت تک اسے کوئی قوت سرنگوں نہ کر سکے گی۔ اگر کوئی اسے تباہ کرے گا۔ تو وہ صرف دجال ہوگا۔ اس عقیدے نے مسلمانوں کو دجال کی قوم باور کرایا جو مغربی کلیسا اور عقیدۂ تثلیث کو ختم کرنے اٹھی تھی۔ عقیدۂ تثلیث بڑی خوں ریزی کے بعد رائج ہوا تھا۔ اسلام کے باعث پھر وہی قدیم مسائل سر اٹھانے لگے تھے جس کے باعث کلیسا کی بقا خطرے میں پڑنے لگی۔

سیاسی اور مذہبی دباؤ کے ساتھ معاشرتی اور ثقافتی دباؤ بھی پڑ رہا تھا۔ جہاں جہاں اسلام نے قدم جمائے عیسائیت کے نقوش پھیکے پڑ گئے عربی نے لاطینی کی جگہ لی۔ خود عیسائی عوام ثقافت و معاشرت میں عربوں کی پیروی کرنے لگے۔ اقتصادی دباؤ ان سب سے شدید تھا۔ بحر روم سے محرومی نے جہازرانی مسدود کی بحری تجارت بند ہوئی۔ بندرگاہیں اجڑیں۔ درآمد برآمد کے خاتمے نے بازار بند کئے۔ شاہی خزانہ، درآمدی ٹیکس کسٹم ڈیوٹی اور بازار ٹیکس سے محروم ہوا۔ صوبوں کی آمدنی جاتی رہی غلاموں کی درآمد بند ہوئی۔ خزانہ اس قابل نہ رہا کہ حکومت کے اخراجات برداشت کر سکے۔ شاہی خدمات کے عوض زمین تقسیم ہونے لگی۔ یہاں تک تقسیم کے لئے زمین بھی نہ رہ گئی۔ حکومت کے تمام ادارے ختم ہو گئے۔ شہر ناپید ہونے لگے۔ زمین امراء کی ملکیت ہو گئی اور غرباء زمین کے غلام

ہو گئے۔

عالمِ اسلام کا یہ ہمہ جہتی دباؤ تھا (باب دوم) جس نے ہر فرد کو سرگرداں کر رکھا تھا۔ نجات کی اگر کوئی امید تھی تو صرف کلیسا کے دم سے تھی۔ کلیسا کے نزدیک ان حالات کا واحد علاج یہ تھا کہ سراسین (مسلمان) اور ان کے مذہب کو مکمل طور پہ تباہ کر دیا جائے تاکہ بہتری کی کوئی شکل پیدا ہو۔

نفرت کا پروپیگنڈا، جذبات میں تلاطم پیدا کرتا رہا۔ تین صدیاں اضطراب میں گذریں اور جب عالمِ اسلام میں اضمحلال پیدا ہوا۔ تو گیارہویں عیسوی کے اواخر میں عالمِ اسلام پر دھاوا بول دیا گیا۔ شام و فلسطین میں صلیبیوں نے اپنی چار لاطینی سلطنتیں قائم کر لیں۔ مصر اور افریقہ کو بھی فتح کرنے کے لئے یورشیں ہونے لگیں۔ اسپین کو عملاً اپنا باجگذار بنا لیا۔ مکمل دو صدیوں تک لاطینی تسلط مسلم ممالک پر برقرار رہا۔ پھر جب یہ تسلط ختم ہوتا نظر آیا۔ تو کلیسا نے صلیبی مقاصد منگولوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ منگول قہرِ خداوندی بن کر عالمِ اسلام پر ٹوٹ پڑے اس کے باوجود صلیبی سورماؤں کو بجز حسرت و یاس کچھ نہ میسّر آیا۔ تیرہویں صدی کے اختتام تک صلیبی سلطنتوں کا نام و نشان مٹ گیا اور مغرب اپنی قدیم حدود میں واپس لوٹ آیا۔

جس دور میں صلیبی جنگیں ناکام ہو رہی تھیں۔ اسپین میں مسلمان قدم بقدم پسپا ہو رہے تھے۔ اسی دور میں ترکانِ عثمانی نے یورپ پر مشرق کی جانب سے پیش قدمی شروع کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی عرب فتوحات اتنی تشویشناک نہ تھی جتنی تشویشناک پندرہویں صدی کی ترک فتوحات تھیں۔ مغرب نے سنجیدگی کے ساتھ خطرہ اسلام سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا۔ دشمنی ان صدیوں میں اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ ایک مفکر بھی ایسا نہیں ملتا جو مصالحت کی تجویز پیش کرتا ہو۔

کل کے نزدیک واحد حل یہ تھا کہ عیسائیت کی تبلیغ مسلمانوں میں کی جائے۔ راجر بیکن نے السنہ مشرق کے حصول پر زور دیا تاکہ راست مطالعے کے ذریعے اسلام کی کمزوریوں کا پتہ چلایا جائے۔ ان پیچیدگیوں کو معلوم کیا جائے۔ جس کے باعث عالمِ اسلام میں